عیدالاضحیٰ، قربانی اور فلسفۂ حیات

ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ
کے ایک جامع خطاب کا ابتدائی حصہ

خطبۂ مسنونہ' متعلقہ آیاتِ قرآنی' کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ' کے بعد:

عیدالاضحیٰ کی نمایاں ترین اور امتیازی شان قربانی ہے۔ اس قربانی کا فلسفہ کیا ہے! یہ کس چیز کی علامت ہے! یہ وہ بات ہے جو خود صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کی تھی۔ اس لئے کہ قرآن مجید نے صحابہ کرام ؓ میں یہ روح بیدار کر دی تھی کہ وہ احکامِ ربانی کی علتیں، مصلحتیں اور حکمتیں جاننے کی کوشش کریں۔ قرآن مجید کا عمومی انداز یہی ہے کہ وہ جو حکم دیتا ہے اس کی عِلّت و حکمت بھی بیان کر دیتا ہے۔ چنانچہ نماز کی حکمت یوں بیان کی گئی ہے کہ:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾

''نماز قائم کرو میری یاد کے لئے''۔

یہ صرف ایک رسم (ritual) نہیں ہے' اس کا ایک معیّن مقصد ہے ـــــ روزہ رکھنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی اس کی حکمت بھی بتا دی کہ:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾

''تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے''۔

لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ روزے کی یہ عبادت بھی محض ایک رسم نہیں ہے' بلکہ اس کا بھی ایک معیّن مقصد ہے اور اس کی بھی ایک حکمت ہے۔ لہٰذا قربانی کی حکمت معلوم کرنے کے لئے صحابہ کرام ؓ نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ:

مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِیُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!

اے اللہ کے رسولؐ ان قربانیوں کی کیا حقیقت ہے؟

دیکھئے اس سوال کے انداز میں بھی ایک بہت پیارا نکتہ پنہاں ہے۔ یعنی صحابہ کرام ؓ عرض کر رہے ہیں کہ قربانی تو ہم دیتے ہی ہیں' کیونکہ آپ ؐ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکم پر عمل کرنے کا دار و مدار حکمت و علّت اور مقصد کے جاننے اور سمجھ لینے پر نہیں ہے' حکم پر عمل تو اصلاً اس لئے ہو گا کہ وہ حکم اللہ یا اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ البتہ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ ہر حکم پر غور و تدبّر کیا جائے اور احکام کی عِلّتیں اور حکمتیں سمجھنے اور دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارے ہاں فقہ میں اجتہاد اور قیاس کا جو معاملہ ہے اس کا دار و مدار احکام کی عِلّت و حکمت کی دریافت پر ہی ہے۔ یہ اپنی جگہ خود ایک علیحدہ بحث ہے کہ کسی حکم کے بارے میں غور و تدبّر کرنا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ اس کا کیا سبب و علّت ہے؟ اس کی کیا حکمت و غایت ہے اور اس کا کیا مقصد ہے؟ ہمارے دین نے اس کی حوصلہ شکنی کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اِسی سے ہمت پا کر صحابہ کرام ؓ نے سوال کیا کہ ہم جو آپ ؐ کے حکم پر عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی دیتے ہیں تو ہمیں یہ بتائیے کہ یہ ہے کیا؟ یعنی اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ یہ کس چیز کے لئے بطورِ علامت ہے؟ تو نبی اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

((سُنَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ))

''یہ تمہارے باپ (حضرت) ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے''۔

یہ اُس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے کہ جس میں ایک سو سالہ بوڑھے باپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر جو نوجوانی کے دَور میں قدم رکھ رہا تھا' چھری پھیر دی تھی۔ جو گویا کہ اللہ کی راہ میں قربانی کی آخری صورت ہو سکتی ہے کہ اپنی محبت' اپنے جذبات اور احساسات کو اللہ کی رضا جوئی کے لئے قربان کر دیا جائے۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اِس لحاظ سے نوعِ انسانی کی تاریخ کی ایک عظیم علامت (symbol) بن گیا ہے اور اس طرح یہ قربانی ہمیشہ کے لئے شعائرِ دین میں شامل ہو گئی ہے۔ یہ اس قربانی کی روح کو بیدار اور برقرار رکھنے کا بھی ایک اہم ذریعہ بن گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو

ایک بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیز بھی قربان کرنے کے لئے تیار رہو۔ چنانچہ یہ حضرت ابراہیم ؑ کی اس قربانی کی یاد ہے جو ہر سال منائی جاتی ہے۔

اب میں چاہوں گا کہ آپ کو بتاؤں کہ اصل میں یہ قربانی حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زندگی میں کس اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی قربانیوں کا وہ کون سا سلسلہ ہے جس کا آخری نقطۂ عروج (climax) یہ واقعہ ہے۔

حیاتِ دُنیوی کا جو فلسفہ قرآن بیان کرتا ہے' وہ سورۃ الملک آیت ۲ کے ذریعے بڑی جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے ــــ میں نے یہاں خاص طور پر ''حیاتِ دُنیوی کا فلسفہ'' کے الفاظ ادا کئے ہیں۔ ہمارے دین کے نزدیک کل حیات یہ نہیں ہے' حیاتِ انسانی بہت طویل ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دَواں' ہر دَم جواں ہے زندگی!

لیکن یہ جو موت ہے اس کے ذریعہ سے حیاتِ انسانی کی طویل زندگی کا ایک انتہائی قلیل ٹکڑا کاٹ لیا گیا ہے۔ یہ جو ٹکڑا کٹ گیا ہے' یعنی موت سے پہلے کی زندگی' تو اس حصے کو انسان دنیا میں بسر کر رہا ہے۔ اب سوچنا یہ ہوگا کہ انسان کی اس دُنیوی زندگی کی غرض و غایت کیا ہے! فرمایا:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾

''اُس ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) نے موت و حیات کا یہ سلسلہ اس لئے تخلیق فرمایا کہ (اس کے ذریعے) تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے''۔

''ب ل و'' مادّہ عربی زبان میں ''پرکھنے'' کے لئے آتا ہے۔ اسی سے باب افتعال میں لفظ ''ابتلاء'' ہے اور اسی سے لفظ ''بلویٰ'' بنا ہے۔ اس ابتلاء کے ذریعے خوف کی حالت میں انسان کی ہمت' اس کے ثبات' اس کی عزیمت اور اس کے صبر کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہ لفظ سورۃ الصافات کی ان آیات میں بھی آیا ہے جن میں حضرت ابراہیم

علیہ السلام کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی پیش کرنے کا تذکرہ ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ﴾

''(اے ابراہیمؑ) یقیناً یہ ایک بہت ہی کھلی (نمایاں' واضح اور کٹھن) آزمائش تھی''۔

پس معلوم ہوا کہ خالقِ کائنات کی طرف سے موت و حیات کا یہ نظام انسان کی ابتلاء' آزمائش' امتحان اور اسے جانچنے اور پرکھنے کے لئے تخلیق فرمایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی آیت میں اس جانچ پرکھ کی غایت بھی بیان کر دی گئی کہ ﴿اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ یعنی وہ (اللہ تعالیٰ) یہ دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔ تم اِس دنیا میں اپنے خالق کی ذات سے محجوب کر دیئے گئے ہو اور اصل حقائق تمہاری نگاہوں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں۔ حقیقت الحقائق ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾۔ الحق اللہ کی ذات ہے اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اب تمہاری آزمائش اور تمہارا امتحان اس میں ہے کہ ہم نے تم کو جو استعدادات دی ہیں' عقل' نظر اور تفکر و تدبر کی جو صلاحیتیں عطا کی ہیں' جو بصیرتِ باطنی عنایت کی ہے تو ایک تو ان کے ذریعے ہم کو پہچانو۔ اِن آنکھوں سے دیکھے بغیر دل کی آنکھوں سے ہمیں دیکھو اور ہماری معرفت حاصل کرو — پہلی آزمائش یہ ہے۔ یہ تو گویا نظری' فکری' عقلی اور علمی آزمائش ہے کہ آیا تم حجابات ہی سے محجوب ہو کر رہ جاتے ہو' پردوں ہی کے نقش و نگار دیکھنے میں محو ہو جاتے ہو' یہیں کی ظاہری آرائش و زیبائش تمہیں مبہوت کر دیتی ہے اور تم اسی کے اندر گُم ہو کر رہ جاتے ہو یا اپنے ربّ کی معرفت حاصل کرتے ہو۔ ہم نے تمہیں پردوں میں رکھا ہے۔ پھر پردے بھی بڑے خوشنما ہیں۔ اس زمین میں جو کچھ ہے اس کو ہم نے اس کی زینت کے لئے بنایا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الکھف:۷)

''یہ جو کچھ بھی سروسامان زمین پر ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تا کہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔

چنانچہ اس میں بھی ایک آزمائش ہے' ابتلاء ہے' امتحان ہے۔ تو پہلی آزمائش عقل اور فکر و نظر کی آزمائش ہے۔ انسان کی جو قوتِ نظری ہے اس کا امتحان ہے کہ یہ انسان

اپنے رب' مالک اور خالق کو پہچانتا ہے یا نہیں ـــــ جبکہ دوسری آزمائش انسان کے ارادے' عمل اور سیرت و کردار کی پختگی سے متعلق ہے۔

﴿اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾

''تم میں سے خوب ترین عمل کون کرتا ہے''۔

اب اگر اپنے مالک و خالقِ حقیقی کو پہچان لیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ انسان اسی سے دل لگائے' اسی سے لَو لگائے' اسی کو مطلوب و مقصود بنائے' اسی کی عبادت و اطاعت کرے۔ اب قدم قدم پر امتحانات آئیں گے۔ دنیا کی چیزیں انسان کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اُس کو آزمائے گا کہ وہ ان آرائشوں اور زیبائشوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا ہماری طرف متوجہ ہوتا ہے' ان کو مطلوب و مقصو بناتا ہے یا ہمیں مطلوب و مقصود بناتا ہے۔ اگر اس کے سامنے یہ متبادل (alternative) راستے رکھ دیئے جائیں کہ یا اللہ کے راستے کو چھوڑ دو یا اپنے عزیزوں کو چھوڑو' وطن کو خیر باد کہہ دو' تو دیکھیں کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ وطن اور اپنے اعزہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے یا اللہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ دوراہا آجاتا ہے کہ یا والدین کو چھوڑے یا اللہ کی توحید کو چھوڑے' تو دیکھیں کس کو چھوڑتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ معاملہ آجائے کہ اپنی زندگی کی قربانی قبول کرے یا اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا رشتہ توڑ دے اور معبودانِ باطل کی پرستش کرنے لگے' تو دیکھیں کہ اس کے بارے میں اس کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ ـــــ اور اگر اس کے سامنے یہ مرحلہ آجائے کہ دنیا کی جو محبوب ترین شے ہو سکتی ہے اس کی محبت اور اللہ کی محبت کے درمیان فیصلہ کرنے کو کہا جائے تو دیکھیں کہ وہ کدھر کا رُخ کرتا ہے بقول شاعر ۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

یہ کُل امتحان ہے ـــــ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پہلا امتحان عقل و فکر کا امتحان ہے' دوسرا امتحان ارادے' نیت' سیرت و کردار اور عمل کا امتحان ہے۔ تو یہ ہے امتحان اور یہ

ہے زندگی کی اصل غرض وغایت۔ ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ — اس کی ترجمانی بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

یہ جو ہماری زندگی ہے' حباب کی مانند(1) ہے۔ یعنی بڑی عارضی' بڑی فانی۔ بلبلہ اب پھٹا کہ اب پھٹا۔ بلبلے کی اس سے زیادہ اور کیا حیثیت ہے۔ اس حیاتِ دُنیوی کی پائیداری پر کوئی اعتماد نہیں ہوسکتا کہ یہ کب تک رہے گی۔ لیکن جتنی دیر بھی یہ بلبلہ قائم رہے' اس کی بھی ایک غرض وغایت ہے' وہ بھی عبث نہیں ہے۔ ذرا اِس کائنات کی وسعتوں کا تصور کیجئے' جس کو علامہ مرحوم نے اس شعر میں قلزم سے تعبیر کیا ہے۔ پس یہ زندگی ایک آزمائش اور امتحان سے زیادہ کوئی حیثیت اور وقعت نہیں رکھتی۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اس امتحان کی جو کامل ومکمل مثال قرآن مجید پیش کرتا ہے' وہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۴ کے ابتدائی حصہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ﴾

''اور یاد کرو کہ جب آزمایا ابراہیم علیہ السلام کو اس کے ربّ نے بڑی بڑی باتوں میں' تو وہ ان سب میں پورا اتر گیا''۔

یہاں لفظ بِكَلِمٰتٍ میں تنوین تنکیر کے لئے آئی ہے۔ اس نے اس کو نکرہ بنا دیا ہے اور تنکیر عربی زبان میں تفخیم کے لئے' یعنی کسی چیز کی عظمت وشان کو بیان کرنے کے

(1) بقول میر تقی میر۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے!

لئے آتی ہے۔ ''بِكَلِمٰتٍ'' میں بڑے بڑے اور کٹھن امتحانات کا مفہوم شامل ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کے ربّ نے بڑے سخت اور مشکل امتحانات لئے لیکن اس اللہ کے بندے نے سب کو پورا کر دکھایا۔ اس کی قوتِ ارادی میں کہیں ضعف وتامل اور تذلل پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی عزیمت میں کمزوری اور تذبذب کے کہیں آثار ہویدا ہی نہیں ہوئے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان امتحانات کو پاس کر گئے تو ان کو یہ بشارت دی گئی:

﴿قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾

''(تو اللہ تعالیٰ نے) کہا (اے ابراہیمؑ) یقیناً میں تمہیں پوری نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بر بنائے طبع بشری فوراً سوال کیا: ﴿وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ﴾ اے اللہ یہ وعدہ صرف مجھ سے ہے یا میری نسل سے بھی ہے؟ جواب ملا: ﴿قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴾ ''میرا یہ عہد ظالموں کے ساتھ نہیں ہوگا''۔ تمہاری نسل میں سے جو ظالم ہوں گے وہ اس وعدے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ ''ظلم'' کے متعلق میں اکثر دروس میں ذکر کر چکا ہوں کہ قرآن کریم میں اکثر و بیشتر ''ظلم'' کے لفظ سے شرک مراد ہوتا ہے۔ تمہارا اصل کمال یہ ہے کہ تم نے توحید کی ترازو میں پورا اتر کر دکھایا۔ اس کی وجہ سے تم ''امام الناس'' کے مقام پر فائز کئے جا رہے ہو۔ اب اگر تمہاری نسل میں سے جو لوگ مشرک ہو جائیں گے تو وہ میرے اس عہد کے حق دار کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس مفہوم کو بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑے سادہ الفاظ میں ادا کیا ہے۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر لائقِ میراثِ پدر کیونکر ہو؟

معاملہ کسی اصول کے تحت ہوگا۔ محض نسل کے اعتبار سے ہو تو یہ انصاف' عدل اور قسط کے منافی ہوگا۔